کالیداس گپتا رضا

"...... بہر حال یہ خاک ہمیشہ سے اُڑتی آئی ہے اور ہمیشہ اُڑتی رہے گی۔ ہم میں اجتماعی کام کرنے کی صلاحیت بہت کم ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ آنے والے پچاس برسوں تک بھی اُردو کی عظمت انفرادی طور پر کئے ہوئے کام ہی کے سہارے باقی رہے گی۔ اجتماعی کام کے سہارے نہیں......"

مصرع طرح تھا کہ

پاس آ آ کے دور جاتے ہیں

مئی (۱۹۳۹ء) کا مہینہ تھا، شدت کی گرمی تھی۔ شام کو غروبِ آفتاب کے بعد ہوسٹل (ایل۔آر دیا آریہ ہائی اسکول۔ جالندھر شہر) کی چھت پر نیاز احمد، مدن لال، گوربچن سنگھ، محمد اسمٰعیل، رمیش وغیرہ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ مجھے گرہ سوجھ گئی۔ میں نے ذرا اونچی آواز سے کہا

وہ مرا ظـــــرف آزماتے ہیں
پاس آ آ کے دور جاتے ہیں

میرے ان دوستوں میں سے کسی کو شعر و شاعری سے شغف نہ تھا۔ وہ اپنی ناکامی اور میری کامیابی پر دل مسوس کر رہ گئے۔ ماش کی دال اور بینگن کے بھرتے کی رکابیاں دھری رہ گئیں۔ دیوار کی اوٹ سے ماسٹر رتن[1] نے سنا اور وہ ہمارے پاس آ گئے۔ رمیش نے ماش کی دال کی رکابی اور ایک پراٹھا ان کی طرف بڑھا دیا۔ دیکھتے ہی فرمایا

ماش کی دال تو نہیں مرغوب
بھرتہ بینگن کا خوب کھاتے ہیں

چند ماہ پہلے رسالہ "مستانہ جوگی" لاہور میں ایک غزل پڑھی تھی، بیدار خدا حافظ، رفتار خدا حافظ۔ ردیف بہت پسند آئی اور بے اختیار سات آٹھ شعر کہہ ڈالے۔ یہ میری پہلی مکمل غزل تھی۔ صرف مطلع یاد ہے

کہتا ہے تجھے دل سے بیمار خدا حافظ
اے پیار خدا حافظ! اے یار خدا حافظ

میرے گاؤں[2] (مکند پور، ضلع جالندھر) میں محرم میں عاشورے کے روز تعزیہ بڑی دھوم دھام سے اٹھایا جاتا تھا۔ جس میں ہندو برابر کے شریک ہوتے تھے۔ ہماری بیٹھک کے سامنے جگہ نسبتاً کشادہ ہے۔ وہاں تعزیہ ذرا زیادہ وقت کے لیے رکتا تھا۔ بیٹھک کے متصل اُپادھیائے براہمنوں کا کنواں (پادھیاں دا کھوہ) تھا۔ اس پر میرے والدِ محترم دو سبیلیں لگاتے تھے ایک لال شکر کی اور دوسری سفید شکر کی۔ میرے والد کٹر آریہ سماجی تھے اور ہمارا سب کا مسلک یہی تھا، مگر بزرگوں کی اس روایت کو

---

[1] پنڈت ہری کرشن رتن ایم۔اے، ایم۔او۔ایل۔ ہمیں اردو و فارسی کا درس دیا کرتے تھے۔ اچھے شاعر تھے، نہایت شریف اور قابل استاد تھے۔ [2] اہلِ مکند پور، مکند پور کو گاؤں کہا کرتے تھے اور آس پاس کے گاؤں والے شہر۔ حقیقت میں اسے قصبہ کہنا چاہیئے۔

جو کئی پشتوں سے جاری تھی پورے اہتمام سے انجام دیتے تھے۔ میں نے خود ان سبیلوں پر گھنٹوں کھڑے رہ کر سینکڑوں تشنگانِ رہِ کربلا کی پیاس بجھائی ہے۔ میری دادی پورے رمضان بھر حاجتمند مسلمانوں کے لیے افطار کا سامان فراہم کرتی تھیں۔ گاؤں کے مسلمان نسبتاً غریب تھے اس لیے ان کی ثقافتی دیکھ ریکھ خوشحال ہندوؤں کا قومی فریضہ بن گیا تھا اور سب لوگ بلالحاظ مذہب و مسلک اسے مستحسن نظروں سے دیکھتے تھے۔ یہ سلسلہ تقسیم ہندوستان (۱۹۴۷ء) تک جاری رہا۔ عاشورے میں ایک سوز خواں خاص طور پر شرکت کرتے تھے۔ میرا یہ مصرع ان کی مکمل خارجی تصویر پیش کرتا ہے۔ ؎

سیاہ رنگت، متین چہرہ، بلند قامت، دراز گیسو

جب وہ ہماری بیٹھک کے سامنے رک کر سوز خوانی کرتے تو میرا دل بھر آتا۔ اشعار کی معنویت اور موزونیت میرے اندر چھپے ہوئے شاعر کو بیدار کر کے جیسے کسی بھری پُری محفل میں لا کھڑا کرتی۔ اکیلے میں بھی ازلی درد، یہی ازلی سوز و گداز مجھے جھنجھوڑتا رہتا۔ میری فرشتہ سیرت والدہ بھی ہمیشہ زیردستوں سے وفا کی نصیحت کرتیں جو دل میں گڑ جاتی۔ میری غزلوں کے ایسے شعر شاید اسی تاثر کی دین ہیں۔ یہ تاثر بچپن سے لے کر آج چون سال کی عمر تک برابر کار فرما ہے ؎

سائے سکتے کی باتیں، اب ہونٹوں پر لانا کیا
رات گئی سو بات گئی، اب دن میں دہرانا کیا
دل کے اندھیرے گوشوں کو چاندنی رات اُجالے کیوں
یادوں سے پُر نور کرو، چاند کی شمع جلانا کیا

جب بگولے نقشِ پا بھی لے اُڑے
خارِ خوں خوردہ نشاں دینے لگا
کوئی کہہ بیٹھا حدیثِ زندگی
اک دیا بجھ کر دھواں دینے لگا

وقتِ آخر ہے نہ اڑ جائے کہیں غم کی مہک — دو گھڑی اور اسے زلفوں میں بسائے رکھنا
سر سے پا تک یہ ترے زخمِ وفا۔ کیا کہنا — اپنے آنگن میں یہی پھول سجائے رکھنا

اضافہ ہو گیا ہے دیکھ کتنا — مرے اشکوں سے تیری دلکشی میں
وہی قاتل، وہی وحشی، وہی غیر — نہ آئی آدمیت آدمی میں

آلام ہمہ جہت اب آلام　　　دُکھ جزوِ حیات بن گیا ہے
آتے جاتے رُلا رہا ہوں　　　نالہ خیرات بن گیا ہے

ہنستے چہروں میں پنہاں الم ۔ الاماں　　　کون ہنستا ہے دل سے کلی کی طرح
یاس کس دستِ غیبی کی ہے منتظر　　　راستے میں لٹی پالکی کی طرح

اُڑتا پھرتا غبار ہر سُو　　　یہ دشتِ رواں کبھی چمن تھا
دُنیا مقتل بنی تھی اور دِل　　　اپنے ہی خیال میں مگن تھا

چل پڑی موت اپنے مسکن سے　　　زندگی کیسی بے خبر ہو گی
وقت آنے دو روپ نکھرے گا　　　سائے پلٹیں گے دوپہر ہو گی

مرا وجود ہے مبہم مگر وجود تو ہے　　　افق کے پار سہی اور کہیں نہ سہی
ازل سے گردشوں میں تھا کہاں صحرا ہوں　　　کوئی بگولہ مجھے ڈھونڈتا نہیں نہ سہی

تجھ بن میرے ارماں، جیسے　　　گل بوٹے اُجڑے آنگن کے
باجے گا جے کا کیا سُنتا　　　بول سُنو دل کی دھڑکن کے
نیلے ہونٹ اور پیلا چہرہ　　　رنگ ہی کتنے ہیں نردھن کے

میں پہلے ہی سے اپنے شعر سنانے میں بہت شرم محسوس کرتا ہوں اور میری یہ روش آج تک قائم ہے۔ اس لیے میرے اردگرد کے (۱۹۴۲ء) بہت کم لوگ جانتے تھے کہ مجھے شعر کہنے کا شوق ہے۔ حالانکہ اس وقت میں استاد سے اصلاح لینی شروع کر چکا تھا اور ذکرِ شعر باقاعدہ کرتا تھا۔ میں نے موسیقی کی تعلیم بطور خاص حاصل کی تھی۔ خوشحالی کا زمانہ تھا۔ میرے یہاں خوب خوب محفلیں ہوتی تھیں۔ روزانہ کے حاضر باشوں میں ایک گویا حسینے خاں تھا۔ راگ کی واقفیت کے علاوہ وہ ایسا خوش آواز تھا کہ اس کی آواز سن کر چہچہاتے ہوئے پرندے بھی شرما جاتے۔ اُسے ایک دن معلوم ہوا کہ میں شعر بھی کہتا ہوں۔ اصرار سے ایک نظم سنی "محبوب کی دعا" جسے اس نے پسند کیا اور اپنی بیاض میں لکھ لیا۔

ہمارے گاؤں سے موضع کھنگر کلاں صرف تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ یہ وہی کھنگر کلاں ہے جس نے شہیدِ اعظم

بھگت سنگھ[1] کو جنم دیا۔ جب کی بات بیان کر رہا ہوں اس وقت بھگت سنگھ کی شہادت کو تیرہ چودہ برس ہو چکے تھے۔ اس سال بیساکھی سے پوتر دن پر دیش بھگتوں نے "بھگت سنگھ شہیدی میلہ" کی بنیاد ڈال دی۔ ہزاروں لوگ جمع ہوئے۔ کھٹکڑ کلاں میں ریلوے لائن کے اس پار آم کے درختوں کے جھنڈ سے لگا ہوا سادہ مگر وسیع اسٹیج تیار ہو گیا۔ اس وقت کے نامی لیڈروں میں ڈاکٹر ستیہ پال نے جلیانوالا باغ امرتسر کی المناک داستان دہرائی جو بیس پچیس سال پہلے اسی روز انگریز کے خونخوار قلم سے لکھی گئی تھی۔ ماسٹر کابل سنگھ نے بھگت سنگھ کی دل بڑھا دینے والی باتیں سنائیں۔ لاہوری رام پردیسی نے اپنا مشہور و مقبول "انگریزی حکومت کا سیاپا (نوحہ)" سنایا۔ لوگ دیوانے ہو ہو گئے۔ چھینے خاں بھی اسی جوش و خروش میں اسٹیج پر وارد ہو گیا۔ وارد کیا ہو گیا بس چھا گیا۔ نظم تھی وہی "محبِ وطن کی دعا"۔ حُب الوطنی اور اردو دونوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ جب چھینے خاں ان مصرعوں پر پہنچا

اے تری رحمت کے صدقے مجھکو یہ انعام دے
جان تک قربان کردوں میں وطن کے واسطے

تو اس کی بے حد سُریلی اور پاٹ دار آواز چند لمحوں کے لئے "انقلاب زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں میں گم ہو کے رہ گئی۔

نظم کے ۹ بند ہیں۔ پہلا اور آخری بند سن لیجئے

وقف میں کیوں ہوں نگارِ سحرِ فن کے واسطے
عشرتِ جاں کے لئے آرامِ تن کے واسطے
مہ وشانِ رقص و لطفِ انجمن کے واسطے
جان تک قربان کردوں میں وطن کے واسطے

کر رہا ہوں میں گنا وِ عشقِ ملکی بر ملا
کوئی دن ایسا بھی میرے دیس پر لا اے خدا
جس دن اٹھ جائے جنازہ ہند سے انگریز کا
اور سازِ دل کی جھنکاروں سے اُٹھے یہ صدا
جان تک قربان کردوں میں وطن کے واسطے

ملک تقسیم ہو کر آزاد ہو گیا۔ میں جون ۱۹۴۹ء میں مشرقی افریقہ چلا گیا وہاں سے ۱۹۷۰ء میں واپس لوٹا اور بمبئی میں سکونت اختیار کر لی اور جب سے اب تک بمبئی ہی میں رہ رہا ہوں۔

---

[1] بھگت سنگھ کے والد سردار کشن سنگھ میرے پتاجی کے بڑے شناسا تھے۔ میں نے انھیں کئی بار اپنے یہاں پتاجی کے ساتھ محو گفتگو دیکھا ہے۔ بھگت سنگھ کے گھر بھی ایک سے زیادہ دفعہ گیا ہوں اور ان کی ماتاجی (سورگباشی پنجاب ماتا) کے ہاتھ کا کھانا بھی کھا چکا ہوں۔

آپ بیتی نثر

۱۹۷۰ء سے اُردو تحقیق کا شوق ہوا ۔ تاریخ سے شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے اس لئے اس میدان میں اترنے کے لیئے مجھے مشقت تو بہت اٹھانی پڑی مگر ایک نومشق کی سی محنت نہیں کرنی پڑی ۔ افریقہ کا کتب خانہ وہیں چھوڑ آیا تھا جو پچانوے فیصد انگریزی کتابوں پر مشتمل تھا ۔ یہاں آکر از سر نو ذاتی کتب خانے کی بنیاد ڈالی ۔ کتابوں کے جمع کرنے کیلئے طرح طرح کے پاپڑ بیلے ۔ میں خود اپنے ذخیرۂ کتب کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں مگر ڈاکٹر گیان چند صاحب کے خیال میں اب یہ کتب خانہ ہندوستان بھر کے ذاتی کتب خانوں میں پہلے نمبر پر ہے ۔ اس میں (ابھی تمام کتابوں کا کیٹ لاگ نہیں بن سکا) ایک اندازے کے مطابق دس ہزار سے زائد کتابیں، رسالے اور دو سو سے زاید مخطوطے ہوں گے ۔ میرا غالبیات کا ذخیرہ شاید دنیا بھر کا سب سے بڑا غالب کلکشن ہے ۔ امید ہے کہ جلد ہی تمام کتب کی تفصیلی فہرست شائع ہوگی ۔ کام شروع ہو چکا ہے ۔

میری تعلیم کچھ زیادہ نہیں ۔ میں نے اردو فارسی پنجاب یونیورسٹی کے ادیب فاضل اور منشی فاضل تک انگریزی لنڈن یونیورسٹی کے میٹریکولیشن تک پڑھی مگر اس نصابی تعلیم کی کمی کو میں نے ایک حد تک اکتسابی تعلیم سے پورا کیا ۔ میرا اندازہ ہے کہ میں نے کم و بیش تین ہزار کتابیں اردو، فارسی، انگریزی کی حرف بحرف پڑھی ہوں گی اور تقریباً اتنی ہی کتابوں کا جزوی طور پر مطالعہ کیا ہوگا ۔ مختلف رسائل بھی ہزاروں کی تعداد میں نظر سے گزرے ہونگے ۔ حوالے کی کتابوں کی ورق گردانی تو ہوتی ہی رہتی ہے ۔ کاروبار کے علاوہ ہر روز تقریباً دس گھنٹے پڑھنے لکھنے کی نذر ہوتے ہیں ۔

مشاعروں اور اجتماعوں سے گھبراتا ہوں ۔ اگر محفل چند ہی افراد پر مشتمل ہو تو لطف اندوز ہوتا ہوں اور اس میں کچھ کہہ سن بھی لیتا ہوں ۔ نام و نمود سے کوئی غرض نہیں ۔ گوشہ نشینی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کام بہت ہوتا ہے اور ڈھنگ کا ہوتا ہے ۔ پروپگنڈہ کبھی میرا اشعار نہیں رہا ۔ پیاتما کی مہربانی سے مالی حالت اطمینان بخش ہے مگر میں نے مال و متاع کو کبھی اپنا نام اچھالنے کیلئے استعمال نہیں کیا ۔ دس تصانیف اب تک منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں اکثر پر انعام بھی مل چکا ہے مگر مجھ پر آج تک نہیں کھل سکا کہ کتابوں پر انعام دینے کا طریقہ کیا ہے اور انعام دینے والوں کو یہ کیسے کر معلوم ہوا کہ میری یہ کتاب اوّل نمبر کی ہے اور وہ کتاب دوسرے درجے کے انعام کے لائق ہے اور یا واقعی میری کوئی کتاب اس لائق بھی تھی کہ اس پر انعام دیا جاتا ۔

بہرحال یہ خاک ہمیشہ سے اُڑتی آئی ہے اور ہمیشہ اُڑتی رہے گی ۔ ہم میں اجتماعی کام کرنے کی صلاحیت بہت کم ہے اس لیئے میرا خیال ہے کہ آنے والے پچاس برسوں تک بھی اُردو کی عظمت انفرادی طور پر کیئے ہوئے کام ہی کے سہارے باقی رہے گی اجتماعی کام کے سہارے نہیں ۔ تصانیف کے نام یہ ہیں :

(۱) شعلۂ خاموشش (مجموعۂ کلام) ۱۹۶۸ء
(۲) شورشِ پنہاں (مجموعۂ کلام) ۱۹۷۰ء
(۳) شاخِ گل (") ۱۹۷۴ء
(۴) اُجالے (") ۱۹۷۵ء
(۵) THE SIELENT FLAME (انگریزی) ۱۹۷۵ء
(۶) مکتوباتِ جوشؔ ملسیانی بنام رعنا (نثر) ۱۹۷۶ء
(۷) منشوراتِ جوشؔ ملسیانی (نثر) ۱۹۷۷ء
(۸) ہندوستانی مشرقی افریقہ میں (") ۱۹۷۷ء
(۹) دعائے صباح (فارسی منظوم ترجمۂ غالب بانثر) "
(۱۰) متعلقاتِ غالب (") ۱۹۷۸ء

"جگبیتی اور باقیاتِ جگبیتی" اس وقت زیرِ طبع ہے۔ جنوری ۱۹۷۹ء تک شائع ہو سکے گی۔ اور بہت سا کام تیار ہے مگر فائنل ایڈیٹ کا منتظر ہے۔ تقریباً اسّی مضامین (بیشتر تحقیقی) لکھے ہوں گے جو مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ اگر صحت نے اجازت دی تو اگلے آٹھ دس برسوں میں میرا بھلا بُرا بہت سا تحقیقی کام منظرِ عام پر آجائے گا۔

میرا تعلق مکند پور (ضلع جالندھر پنجاب) کے مشہور اگروال خاندان سے ہے۔ میرے بزرگ (میری ساتویں پشت ہے) ضلع حصار (ہریانہ) کے ایک گاؤں کھرک پونیاں سے ہجرت کر کے مکند پور آبسے تھے۔ یہاں آکر بہت عزت اور شہرت پائی۔ امارت میں بھی اور شرافت میں بھی۔ خاندانی پیشہ ساہوکاری تھا۔ مجھے ابھی دو برس پہلے تک اپنی صحیح تاریخ ولادت کا علم نہ تھا مگر پرانے کاغذات سے اصل یادداشت نکل آئی تو معلوم ہوا کہ میرا جنم ۲۵ اگست ۱۹۲۵ء کو پانچ بجے بعد دوپہر ہوا تھا۔

میری شادی نیروبی (مشرقی افریقہ) میں ۴ اگست ۱۹۵۶ء کو ساوتری دیوی سے ہوئی[1]۔ میرے خسر سورگیہ لاجپت رائے گپتا ایک مدت سے تنزانیہ کے شہر اروشا میں مقیم تھے۔ میرے دو بچے ہیں۔ لڑکا وِمل اور لڑکی ریتا۔ اس وقت دونوں ہی کالج میں زیرِ تعلیم ہیں۔

خاندانی پیشہ ساہوکار تھا۔ اب بھی وہی ہے۔ اب اسے ساہوکار نہیں بنکنگ کہا جانے لگا ہے۔ چلو یوں ہی سہی۔ ذہن میں بہت کچھ محفوظ ہے۔ چند برسوں میں سب لکھ ڈالوں گا۔ شاید اب یہی مناسب ہوگا۔ دل بھی یہی کہتا ہے ؎

ہے عمرِ اخیر اور نہ دیکھو بھالو
آنکھوں میں ہیں جو خواب انھیں کو پالو
جی کھولو، قلم ہاتھ میں لو، السٹو ورق
محفوظ ہے جو ذہن میں سب لکھ ڈالو

---

[1] استاذی قبلہ جوش ملسیانی مرحوم نے میری شادی پر یہ قطعہ لکھ کر بھیجا تھا ؎

ڈاک نے مجھ کو سنایا مژدہ
ہونے والی ہے رضا کی شادی
کانے کوسوں کا سفر ہے اے جوش
بھیج دو خط میں مبارک بادی

SOLE DISTRIBUTORS

SAKAR PUBLISHERS PVT., LTD.
107-JOLLY BHAVAN NO. 1,
10 NEW MARINE LINES,
BOMBAY-400 020.

آپ بیتی نمبر
نگراں
کالیداس گپتا رضاؔ
مدیر
صابر دت